علامہ اقبال کے جرمن معاصر کے روزنامچے میں اقبال کی آخری شام کا احوال

ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Personal diaries are considered a basic and reliable source of information about great figures. The writer has got the opportunity to discover about the last evening of Sir Mohammad Allama Iqbal through the memories of Hans-Hasso Baron Von Veltheim, an old friend of Allama Iqbal from Germany. Hans-Hasso wrote about the last meeting with Allama Iqbal in his personal diary. The original script of the diary is in Halle University, Halle-Salle, Germany. Urdu translation of the German diary with references is given in this article.

ہنس ہاسو فان والتھائیم (Hans-Hasso Von Veltheim) کے جرمن سوانح نگار ڈاکٹر کارل کلاؤس (Dr.Carl Claus) کے مطابق ہنس ہاسو نے ڈائری لکھنے کا آغاز یکم نومبر ۱۹۰۶ء سے کیا تھا کہ جب وہ انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے آبائی قصبے آسٹراؤ چلے گئے تھے اور جہاں انھوں نے شدید تنہائی کے عالم میں اپنی زندگی کے معمولات اور مشاہدات کو ڈائری میں درج کرنا شروع کر دیا تھا۔ ڈائری لکھنے کی ان یہ عادت آگے چل کر ان کی فطرتِ ثانیہ سی بن گئی اور اس کے مندرجات کی اشاعت سے جہاں جرمنی کے نازک عہد کی سچی تصویر سامنے آئی تو وہاں جرمن فلسفہ اور شعر و ادب کے معاصر رویے بھی محفوظ ہوتے چلے گئے۔ ہنس ہاسو کا یہ روزنامچہ ایشیاء کی سیاحتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ مطبوعہ روزنامچے کے سرورق پر ذیلی عنوان کے تحت بمبئی، کلکتہ، کشمیر، افغانستان، ہمالیہ، نیپال اور بنارس کا ذکر ملتا ہے۔ ہنس ہاسو کی کا یہ روزنامچہ انھی منطقوں کی سیاحتوں کا احوال بیان کرتا ہے۔ مطبوعہ روزنامچے میں ذیلی عنوان کے طور پر ان سیاحتوں کے دورانیہ بھی درج ہے جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک کے زمانے پر محیط ہے۔ کشمیر کے عنوان سے ایک حصہ شامل کیا گیا ہے۔ اس حصے کا

آغاز علامہ اقبال کے اس شعر کے جرمن ترجمے سے ہوتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
سر محمد اقبال
پیدائش ۱۸۷۶ء سیال کوٹ
وفات لاہور، ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء
(کشمیر کے عنوان کے تحت لکھے جانے والے روز نامچے کے حصے کی عکسی نقل مقالے کے آخر میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے)

جرمنی کے بین الاقوامی روابط بالخصوص جنوبی ایشیاء کے ساتھ ربط و ضبط کی کئی اہم شہادتیں بھی اس ڈائری کے اوراق سے جھلکتیں ہیں۔اس ڈائری کی ورق گردانی کرتے ہوئے راقم کو کئی مقامات پر قائداعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خان اور دیگر سیاسی اکابر کا تذکرہ دکھائی دیا۔ پاکستان کے قیام اور قیام کے بعد یہاں کی صورتِ حال کو جرمنی کے اہلِ نظر کس انداز سے پرکھ رہے تھے،اس کا احوال اس ڈائری کے اوراق سے مل جاتا ہے۔ یہ ڈائری اپنی سیاسی اور تہذیبی اہمیت کے ساتھ ساتھ اقبالیات کے لیے اس لیے بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ اس میں ہنس ہاسو نے علامہ اقبال سے اپنی آخری ملاقات کا احوال رقم کیا تھا۔

ہائیڈل برگ یورنیورسٹی، جرمنی سے پوسٹ ڈاکٹوریٹ کرنے کے دوران میں راقم کو علامہ اقبال اور ہنس ہاسو کے مابین روابط کے نقوش اجاگر کرنے کے لیے دستاویزات کی تلاش رہتی تھی کہ جن کی بنیاد پر اس ربط کو اجاگر کیا جا سکے یا جن رابطوں کی طرف محققین نے اب تک اشارے فراہم کئے ہیں،ان کی تصدیق یا تردید کی لیے دستاویزات سامنے لائی جا سکیں۔ ہماری بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح ہنس ہاسو کی مذکورہ ڈائری کے اصل متن تک رسائی حاصل کی جائے اور اس ڈائری میں سے علامہ اقبال سے متعلق ہنس ہاسو کی یادداشتوں کا حصہ سامنے لایا جائے۔اگرچہ ہنس ہاسو کی یہ ڈائری تین جلدوں کی صورت میں ان کی وفات سے ایک سال قبل جرمنی سے ہی شائع ہو چکی تھی اور جنوبی ایشیاء سے متعلق علمی وادبی تحقیقات کے باب میں ان کی یہ مطبوعہ ڈائری اہم ماخذ کا درجہ اختیار بھی کر چکی تھی۔ جرمنی پہنچتے ہی ہنس ہاسو کی یہ مطبوعہ ڈائری ہمیں کتب خانے سے مل گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اکساہٹ پیدا ہوئی کہ اس کے اصل مسودے تک رسائی حاصل کی جائے کہ ممکن ہے اصل مسودے اور مطبوعہ کتاب کے متن میں سے کوئی اختلاف سامنے آ جائے یا کوئی اور دستاویزی شہادت اصل مسودے سے مل سکے۔اس لیے اصل مسودے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی۔

ہمارا گمان تھا کہ ہنس ہاسو کی ڈائری کا اصل مسودہ ان کے آبائی محل میں موجود ہو گا۔ برلن کے قدرے نزدیک واقع آسٹراؤ کا قصبہ ہنس ہاسو کا آبائی علاقہ ہے کہ جہاں ان کا محل آج بھی نیم منہدم حالت

میں گزرے وقتوں کی کہانی سناتا ہے۔اس محل کی نگہداشت کرنے والی تنظیم کے چیئرمین سے ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹرہلڈ(Dr. Christina Oesterheld) کی وساطت سے جب ہمارا رابطہ ہوا تھا تو انھوں نے واضح کر دیا تھا کہ ہنس ہاسو کی مطبوعہ ڈائری کا مسودہ یہاں پر موجود نہیں ہے لیکن دوران گفتگو وہ ایک بڑی پرکشش بات کہہ گئے کہ ان کے پاس ہنس ہاسو کے ہاتھ سے کھینچی ہوئی ایک تصویر ہے جو بسترِ مرگ پر موجود کسی ہندوستانی کی معلوم ہوتی ہے۔ اب چونکہ ہنس ہاسو علامہ اقبال کے آخری ملاقاتی تھے اور وینیری گوروڈے کی لنڈس آرکائیو میں ہنس ہاسو کی دستاویزات کے مشاہدے سے ہنس ہاسو کی شخصیت کا ایک فنکارانہ پہلو سامنے آیا تھا کہ آپ فوٹوگرافی کا عمدہ ذوق رکھتے تھے اور اپنے سفر کے مختلف مراحل کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرتے چلے تھے، اس لیے ممکن ہے کہ انھوں نے علامہ اقبال سے اپنی اس آخری ملاقات میں ان کی زندگی کے آخری شام کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کر لیا ہو۔اگرچہ تصاویر وغیرہ تحقیق میں کیا اہم ہوتی ہیں لیکن پھر بھی یہ سن کر جسم و جان جیسے بیدار سے ہو گئے کہ اس دانائے راز کی آخری شام کی تصویر دنیا کے کسی خطے میں موجود ہے۔ ہمارے گمان کے مطابق یہ تصویر اگر علامہ اقبال کی ہے تو علامہ کی تصاویر کے ذخیرے میں اہم اضافہ ہو گا۔اس پرکشش بات کو سنتے ہی راقم نے آسٹراؤ جانے کے ارادے کو پختہ کیا۔آسٹراؤ میں ہنس ہاسو کا آبائی محل جرمن تہذیب و ثقافت کی ہندوستانی معاشرت کی جانب جھکاؤ کی علامت رہ چکا ہے۔محل کے اطراف میں چہل قدمی کے لیے بنائے جانے والے رستوں سے لے کر محل کی اندرونی دیواروں تک ہندوستانی ثقافت کے گہری چھاپ موجود ہے۔خود ہنس ہاسو نے اپنی زندگی میں اس محل کو ہندوستانی تہذیب کا مرکز بنا دیا تھا۔اس محل میں باقاعدگی کے ساتھ ہندوستان، افغانستان اور ایشیاء کے دیگر خطوں سے آنے والے سیاست دان، حکمت و دانش کے رسیا اور فنونِ لطیفہ سے وابستہ افراد نہ صرف مہمان ہوا کرتے تھے بلکہ ہندوستانی معاشرت پر کئی اہم تقریبات اسی محل میں منعقد ہوئی تھیں ۔اس تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر آسٹراؤ جانا ایک طرح سے رومان سا بن گیا۔ایک اور پہلو بھی دل کے کسی گم نام سے گوشے میں بھنور سا بنا جاتا تھا کہ مجھے اپنے دیہی پس منظر کی وجہ سے دیہی علاقے اپنی جانب خطرناک حد تک کھینچتے ہیں ۔کئی بار تیز رفتار ریل گاڑی سے اترنے کو جی چاہا کہ جب وہ جرمنی کے دیہی ڈھلوانی میدانوں کے بیچوں بیچ گزر رہی ہوتی تھی۔آسٹراؤ ایک طور قصبہ ہے اور جرمنی کی قصباتی زندگی کا مشاہدہ اسی سفر سے جڑا ہوا تھا۔علامہ اقبال کے نام اپنے مکتوب میں ہنس ہاسو نے انھیں اسی محل میں آنے کی دعوت دی تھی کہ جسے انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا تھا اور ہمیشہ کی طرح جرمنی آنے کے عزم کو دوہرایا تھا۔ یہ سب چیزیں یک جا سی ہوتی چلی گئیں ۔دوسری طرف انڈالوجی کے سربراہ ڈاکٹر ہنس ہارڈر (Dr.Hans Harder) نے ہالے یونیورسٹی میں شعبہء اسلامیات اور عربی کے ایک نامور اسکالر ڈاکٹر پیٹرک فرانکے (Dr.Pertrik Franke) سے رابطہ کیا کہ جنھوں نے ہنس ہاسو کے کاغذات اور کتب خانے کے بارے میں اطلاع دی کہ ان سب چیزوں کا ایک بڑا حصہ آسٹراؤ سے ہالے یونیورسٹی میں منتقل کر دیا

گیا تھا، لہٰذا ایک امید ہے کہ ان کی ڈائری کا قلمی نسخہ اس ذخیرے میں موجود ہو گا۔آسٹراؤ اور ہالے قریب قریب واقع ہیں ۔راقم کو ان دونوں جگہوں پر جانے کا موقع ملا۔آسٹراؤ میں جس تصویر کی نشان دہی کی گئی تھی وہ علامہ اقبال کی نہیں تھی۔آسٹراؤ میں محل کی دیواریں باقی تھیں کہ جنہیں اپنے محدود وسائل میں رہ کر وہاں کی مقامی تنظیم نے آباد رکھا ہوا تھا۔آسٹراؤ ہی میں ہنس ہاسو کا آبائی اور خاندانی گرجا گھر ہے کہ جس کی بالائی منزل پر ان جسدِ خاکی کو کلون سے منتقل کر کے رکھا گیا تھا۔گرجا گھر کے اس حصے میں ہنس ہاسو کی چند دستاویزات کہ جن میں ان کے پاسپورٹ ،سفری دستاویزات اور تعلیمی اسناد شامل ہیں ، رکھی ہوئی تھیں ۔اسی حصے میں عالمی جنگ کی بہت سی نایاب تصاویر بھی موجود تھیں کہ جنہیں ہنس ہاسو نے خود اپنے کیمرے سے بنایا تھا۔آسٹراؤ میں ہنس ہاسو کے تعلیمی اور سفری کاغذات راقم کو وہیں سے حاصل ہوئے ۔اس سفر میں ڈاکٹر پیٹرک فرانکے نے کمال محبت کا ثبوت دیا اور اپنی نجی اور پیشہ ورانہ مصروفیات ترک کر کے اپنے دو طالب علموں سے ساتھ یہ سفر اختیار کیا ۔ان طالب علموں میں ایک نے ہنس ہاسو پر ایم ۔فل کی سطح کا مقالہ تحریر کیا تھا جبکہ دوسرا آسٹراؤ کا مقامی باشندہ تھا ۔ان دونوں نوجوانوں کی وجہ سے مقامی آبادی سے میل جول ، مکالمے اور دستاویزات کے حصول بڑی آسانی رہی ۔ایک غیر معمولی تاثر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہنس ہاسو کی آخری آرام گاہ کے سرہانے علامہ اقبال کی ایک تصویر اخبار کے تراشے کی صورت میں آویزاں ہے۔

ہالے یونیورسٹی ، جرمنی اسلامی تاریخ اور تہذیبی مطالعہ کا بہت اہم مرکز ہے۔ راقم نے وہاں پر موجود ہنس ہاسو کے کاغذات کی چھان پھٹک کی جن میں سے ان کی مطبوعہ ڈائری کا اصل مسودہ تین جلدوں کی صورت میں مل گیا۔اصل مسودہ ٹائپ رائٹر کی مدد سے لکھا گیا ہے کیونکہ ہنس ہاسو اپنی تمام تحریریں ٹائپ رائٹر پر لکھا یا لکھوایا کرتے تھے۔اصل مسودے کے پہلے صفحے پر ایک انتباہ درج ہے کہ یہ مسودہ اشاعت کے لیے نہیں ہے۔ ڈاکٹر پیٹرک فرانکے نے ہماری معلومات میں مزید اضافہ کیا کہ ہنس ہاسو نے اپنی ڈائری کی دو سو نقول تیار کروا کر اسے اپنے نہایت قریبی دوستوں کو ارسال کیا تھا ۔یہ ڈائری جرمن زبان میں ہے ۔اس حوالے سے ایک صراحت ضروری ہے کہ ۲۰۰۲ء میں سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی ، گورنمنٹ کالج، لاہور کی طرف سے راقم نے ''اقبال ۔مشرق ومغرب کی نظر میں'' کے عنوان سے ایک کتاب اشتراک کے ساتھ مرتب کی تھی ۔اس کتاب کے لیے مستشرقین کے اقبال پر لکھے جانے والے مقالات کے حصول کے ضمن میں اس ڈائری میں علامہ اقبال سے متعلق یاداشتوں کی حصے ایک جرمن کتاب سے حاصل ہوئے تھے کہ جو جرمن سنٹر میں عامر رفیق کی معاونت سے اردو میں ڈھالے گئے تھے۔اس سارے عمل میں ایک قباحت یہ تھی کہ اس وقت تک مطبوعہ ڈائری تک ہمیں رسائی حاصل نہ ہوئی تھی اور عامر رفیق صاحب اس شرط پر تعاون پر آمادہ ہوئے تھے کہ وہ ایک سے زائد نشستوں میں یہ کام انگریزی میں مکمل کروائیں گے۔راقم کو تین چار مرتبہ ان کے ہاں جانا پڑا۔ وہ متن پڑھ کر اسے انگریزی میں بیان کرتے تھے اور میں اس مفہوم کو اردو میں منتقل کرتا جاتا تھا۔اب جرمنی میں آنے کے بعد

خیال تھا کہ اس خام صورت کو بہتر بھی بنانا ہے۔ہنس ہاسو کی مطبوعہ ڈائری کے ساتھ ساتھ اس کا اصل مسودہ بھی حاصل کیا گیا تا کہ اگر کہیں اختلافِ متن ہو تو اس کی نشان دہی کی جائے اور اردو ترجمہ پرنظرِ ثانی کے لیے ڈاکٹر کرسٹیا اوسٹر ہلڈ سے درخواست کی جائے۔انھوں نے ڈائری کے اصل مسودے کو سامنے رکھ کر ترجمہ پر نظر ثانی کی اور ایک دو اصلاح طلب مقامات کی نشان دہی کی۔مطبوعہ اور اصل مسودے میں اختلافِ متن کی کوئی صورت موجود نہیں تھی۔ اس ڈائری میں ہنس ہاسو نے علامہ اقبال کا تذکرہ دو مختلف تاریخوں اور مختلف مقامات پر کیا ہے کہ جنھیں یک جا کرنے کے بعد اسے اردو زبان میں منتقل کیا گیا۔ڈائری کے اصل مسودے اور مطبوعہ ڈائری سے متعلقہ صفحات دونوں کے عکس اس مضمون کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔

علامہ اقبال اور ہنس ہاسو فان والتھائیم(Hans Hasso von Veltheim) کے مابین روابط کے باب میں اقبالیات کی روایت قدرے خاموش ہے۔اس حوالے سے ان دونوں معاصرین کے مابین باہمی روابط کی نشان دہی کے لیے دستاویزات کی تلاش اور تجزیے کا کام موثر انداز میں سامنے نہیں آ سکا، شاید اس کا سبب یہ کہ حیاتِ اقبال کے ماہرین نے علامہ اقبال کی حیات کی جزئیات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی یورپ میں موجود ماخذات تک مکمل رسائی کا انھیں موقع مل سکا ہے۔علامہ اقبال اور ہنس ہاسو کے درمیان تعلق کی قدیم ترین اور شاید اولیں تحریری شہادت برصغیر سے شائع ہونے والے ایک انگریزی اخبار میں شائع ہونے والی اس خبر کی صورت میں ملتی ہے:

> "On wednesday night he was quite cheerful and talked at length with Baron von Veltheim, an old friend from Germany.They discussed philosophy and politics about midnight Then The visitor left and Sir Mohammed Iqbal went to sleep.He woke up at about 2 a.m and complained of swelling in his left arm....The last word uttered by Sir Mohammad Iqbal were:"I am a muslim.I do not fear death.I shall welcome it with a smiling coantenace".[۱]

علامہ اقبال کی وفات کے بعد انگریزی اور اردو اخبارات میں تعزیتی پیغامات تسلسل کے ساتھ ایک مدت تک شائع ہوتے رہے تھے کہ جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ہنس ہاسو نے علامہ اقبال کی وفات پر ان کے فرزند جاوید اقبال کو تعزیتی خط ارسال کیا تھا۔ہنس ہاسو کا یہ تعزیتی خط جو تعزیتی پیغام کے طور پر شائع ہوا،اقبال اور ہاسو کے درمیان قلبی تعلق کی دوسری اہم معاصر شہادت ہے جس کے بارے میں ہنس ہاسو اپنی مطبوعہ ڈائری میں لکھتے ہیں:''ان کے فرزند شیخ جاوید اقبال کو میں نے تعزیت نامہ ارسال کیا تھا جو بعد میں

ہندوستان کے اخبارات میں شائع بھی ہوا''۲؎

علامہ اقبال کے چند ایک سوانح نگاروں نے شاید اخبارات کی انہی اطلاعات کو بنیاد بناتے ہوئے ان کی آخری شام میں ہنس ہاسو سے ملاقات کو اشارتاً درج کیا ہے کہ جس سے اس ملاقات کی تفصیل کا اندازہ نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال کے سوانح نگاروں میں سے ہنس ہاسو کی اس ملاقات کا ذکر عبدالمجید سالک نے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:'' ۲۰ اپریل کو سہ پہر کے وقت علامہ درد پشت کی وجہ سے بہت بے چین تھے کہ اتنے میں ان کے ایک پرانے ھم جماعت (جو ھائیڈل برگ جرمنی میں ان کے ہم سبق تھے) بیرن فان فلٹ ھائم اتفاق سے ملاقات کو آ نکلے۔ ان کا ایک پارسی دوست بھی ساتھ تھا۔ علامہ نے ان سے خوب جی بھر کر باتیں کیں اور طالب علمی کے زمانے کی باتیں بڑے لطف سے یاد کرتے رہے۔ یہ صاحب آخری بیرونی ملاقاتی تھے جو علامہ کی خدمت میں باریاب ہوئے''۳؎۔ سالک صاحب کے علاوہ محمد شفیع (م ش) نے بھی اپنے ایک مضمون'' اقبال کے آخری چوبیس گھنٹے'' میں ہنس ہاسو اور اقبال کی اس ملاقات کا تذکرہ چند سطور میں کیا ہے۔ ہمیں گمان ہے کہ عبدالمجید سالک اور محمد شفیع کے بعد کے سوانح نگاروں نے انہی کی معلومات کو بنیاد بناتے ہوئے ضمنی طور پر اس ملاقات کا ذکر ایک آدھ سطر میں کر دیا اور اپنے طور اس میں کچھ اضافہ نہیں کیا۔ جاوید اقبال نے بھی'' زندہ رود'' میں مختصر طور پر ہنس ہاسو کی اس شام جاوید منزل آمد کو بیان کیا ہے:'' کوئی ساڑھے چار بجے بیرن فان والتھائیم انہیں ملنے کے لئے آ گئے۔ بیرن فان والتھائیم نے جرمنی میں اقبال کی طالب علمی کے زمانے میں ان کے ساتھ کچھ وقت گزارا تھا اور اب وہ جرمنی کے نازی لیڈر ہٹلر کے نمائندے کی حیثیت سے ہندوستان اور افغانستان کا سفر کر کے شاید ان ممالک کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہندوستان کا دورہ مکمل کر چکنے کے بعد وہ کابل جا رہے تھے۔ اقبال اور بیرن فان والتھائیم دونوں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ہائیڈل برگ یا میونخ میں اپنی لینڈ لیڈی، احباب اور اساتذہ کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اقبال نے انھیں سفرِ افغانستان کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ جب بیرن فان والتھائیم جانے لگے تو اقبال نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کر کے انھیں رخصت کیا''۴؎۔ عبدالمجید سالک، محمد شفیع، جاوید اقبال، اعجاز احمد اور اقبال کے دیگر سوانح نگاروں کی تحریر سے یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ اس طویل ملاقات میں کیا کیا موضوعات زیرِ بحث آئے اور اس ملاقات کا مقصد کیا تھا۔ کیا اس ملاقات کو تجدیدِ تعلق کہا جا سکتا ہے یا اس کا کچھ سیاسی پس منظر بھی تھا کیونکہ ہنس ہاسو نازی پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے افغانستان جا رہے تھے اور افغانستان روانگی سے قبل اقبال سے ملنے اور شاید اس سفر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کا رقعہ لینے جیسے اہم اشارے بھی موجود ہیں۔ ''ذکرِ اقبال''، ''زندہ رود''، ''مظلوم اقبال'' جیسی اہم تصانیف میں بھی اس ملاقات کا سرسری سا ذکر ملتا ہے۔

اقبال کے سوانح نگاروں اور ماہرین کے ہاں ہنس ہاسو کی اقبال سے متعلق یادداشتوں کی نشان دہی نہیں ملتی۔ مستشرقین میں سے آنا میری شمل نے اپنے مضمون'' اقبال اور جرمنی''۵؎ میں ہنس ہاسو اور ان کی علامہ

اقبال سے ملاقات کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اس ڈائری کی نشان دہی بھی کی۔ اگرچہ انھوں نے بھی ان دونوں شخصیات کے روابط پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی لیکن انھیں یہ خیال ضرور گزرا کہ دونوں (اقبال اور ہنس ہاسو) کے مابین قدیمی روابط تھے۔ آنا میری شمل نے ہنس ہاسو کی مطبوعہ ڈائری میں سے چند سطور بھی اپنے اس مضمون میں نقل کی ہیں کہ جن میں ہنس ہاسو نے علامہ اقبال سے اپنی آخری ملاقات کا احوال لکھا ہے۔

ذیل میں ہنس ہاسو کے مطبوعہ روز نامچے کی عکسی نقل اور اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اصل متن میں عنوان درج نہیں ہے، ہم نے سہولت کی خاطر اپنے طور اسے درج کر دیا ہے۔ ہنس ہاسو کے روزنامچے کے درج ذیل اردو ترجمے پر ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہلڈ نے نظر ثانی فرمائی جس کے لیے راقم ان کا ممنون ہے۔ ہنس ہاسو نے اپنے روز نامچے کے درج ذیل حصے میں علامہ اقبال اور بھگوت گیتا کے چند اشعار کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ ذیل میں اصل اشعار درج کرتے ہوئے اردو نثر میں ان کا مفہوم پیش کر دیا گیا ہے۔

HANS-HASSO VON VELTHEIM-OSTRAU

TAGEBÜCHER
AUS ASIEN

Erster Teil
Bombay · Kalkutta · Kashmir
Afghanistan · Die Himalayas
Nepal · Benares
1935–1939

CLAASSEN VERLAG
HAMBURG

ہنس ہاسو کے مطبوعہ روز نامچے کا سرورق

KASHMIR

> Indien ist das Land der Länder,
> ist das schönste Land von allen;
> und in diesem Rosengarten
> sind wir selbst die Nachtigallen.
>
> *Sir Mohammed Iqbal,*
> *geboren 1876 in Sialkot,*
> *gestorben Lahore, 21. April 1938*

Am Ostermontag 1938 nachmittags trat ich, aus Kalkutta abfahrend, meine mehrere Tage und Nächte dauernde Reise nach Kashmir an. Ich reiste in der zweiten Klasse mit einem Zoologie-Professor der Universität Lucknow, dessen Frau im Damenabteil fuhr. Sein Koch und sein Diener kamen öfters ins Abteil, um uns zu bedienen. Der Professor hatte noch mehr Gepäck als ich, da er unter anderem mit einer riesigen Schreibmaschine und einer ganzen, recht sinnreich in Kisten eingerichteten Küche reiste. Wir hatten einen bis Lahore durchgehenden Wagen mit dem europäischen, ebenfalls bis Lahore fahrenden Speisewagen daneben. Während der beiden Tage Bahnfahrt von Kalkutta bis Lahore blieb ich der einzige Gast in diesem Speisewagen mit seinem anglo-indischen Oberaufseher, zehn weißbehandschuhten indischen Dienern und dem Küchenpersonal. Im Zuge gab es noch einen zweiten Speisewagen nur für Mohammedaner.

Der Zug fuhr sehr schnell und hielt durchschnittlich nur alle drei bis vier Stunden. Der Hitze wegen hatte ich mir von der Bahn einen Eiskasten geliehen, der immer wieder unterwegs mit einem etwa ein Zentner schweren Eisblock gefüllt wurde. Am Tage hält so ein Block etwa sechs bis sieben Stunden vor, nachts länger. Der Eiskasten, der horizontal mit einem Rost, auf dem der Block liegt, versehen ist, wird in die Mitte des Abteils gestellt, und alle elektrischen Ventilatoren werden auf das Eis gerichtet. Man mußte alle Fenster mit den blauen Sonnenscheiben und den weißen Glasfenstern dauernd geschlossen halten. Nur schlossen die dreifachen Fenster und die Türen nicht dicht, so daß alles voller Staub war, der auf Hauptstationen durch besondere Kulis und unterwegs vom Diener ausgefegt wurde. Richtet man die Ventilatoren ein wenig anders, dann sitzt man in dem von ihnen aufgewirbelten Staube, der alles ohne Ausnahme durchdringt. Immerhin vermochte der ständig ange-

136

کشمیر کے عنوان سے باب کا پہلا ورق

blasene Eisblock die Temperatur im Abteil um einige Grade herabzudrücken. Je weiter wir vom Meere fortkamen, um so geringer wurde der Luftfeuchtigkeitsgehalt. Wenn auch die Hitze zunahm, so war sie doch leichter zu ertragen.

In Indien muß man auf der Bahn, in Unterkunftshäusern und meist auch in Privathäusern sein eigenes Bett mit allem Zubehör, wie Kissen, Decken, Wäsche, nur mit Ausnahme der Bettstelle, mitschleppen. Da die Bettstellen gewöhnlich eine Bretterauflage oder breite, geflochtene, stramm gespannte Gurte haben, sind die Betten für mein Empfinden sehr hart. Die meisten Inder schlafen am liebsten auf einer dünnen Matte auf dem Fußboden. Ich hatte mir eine mit einem kleinen Blasebalg aufzublasende Gummimatratze, die sich vorzüglich bewährte, als Unterlage mitgenommen.

Am Dienstag früh, etwa acht Uhr, fuhren wir langsam über die hohe Gangesbrücke bei Benares, welches man in seiner ganzen Ausdehnung liegen sah. Auf beiden Stationen der heiligen Stadt hielten wir länger. Um zwei Uhr mittags waren wir in Lucknow. Das Bahn-Thermometer zeigte fünfundvierzig Grad Celsius im Schatten. Trotzdem empfand man die sehr trockene Hitze lange nicht so wie die geringere in Kalkutta. In eine gelbe Staubwolke gehüllt, raste der Zug weiter, und ich blieb im langen Zuge und Speisewagen der einzige Weiße. Der Oberaufseher des Speisewagens, den ich nach den Gründen fragte, warum der Zug nicht von Weißen besetzt sei, erzählte, daß nun in der begonnenen heißen Zeit alle Touristen Indien verlassen hätten, daß aber auch die in Indien lebenden Europäer in ihren Ferien nicht mehr so zahlreich in die kühlen Berg-Sommerfrischen führen, weil diese ebenso teuer geworden wären wie eine der verbilligten Schiffs-Ferien-Fahrten nach Europa. Wer es sich leisten könne, fliege wohl auch in seinem Urlaub schnell nach Europa. Außerdem hätten die Eisenbahnunglücke und die Überfälle auf die Züge stark zugenommen. Auf unserer Strecke ereignete sich vor drei Monaten eine Entgleisung, bei der einhunderteinundsiebzig Personen getötet wurden, und in den letzten vierzehn Tagen sei dieser Zug dreimal überfallen worden. Nette Aussichten, dachte ich! Es geschah aber nichts dergleichen! Unterwegs sah ich junge Betel-Kulturen; ganze Felder davon wurden der Sonne wegen mit Palmblattdächern und -wänden umgeben. Alles, was man tagsüber berührt, war viel heißer als der eigene Körper, sei es die Serviette, die Bestecke, Stuhl, Tisch, Bücher usw. Das kam mir zuerst ungewohnt und fremd vor.

Tags darauf, früh sieben Uhr, kamen wir durch Amritsar mit seinem berühmten goldenen Tempel der Sikh. Eine Stunde später wurde

137

ich in Lahore an der Bahn von meinem alten Freunde Jamshed Vesugar abgeholt, der mit seiner Frau im vorigen Jahre einige Wochen mein Gast in Ostrau war. Beim Fürsten Kanvar Dalipsingh und der Kanvarani erhielt ich, wie vor drei Jahren, ein schönes, kühles Gastzimmer mit europäischem Badezimmer. Ich nahm zwei Bäder hintereinander, um die Dreckkrusten der Bahnfahrt von fast achtundvierzig Stunden loszuwerden. Am Nachmittag besuchte ich den berühmten Dichter und Philosophen Sir Mohammed Iqbal. Er empfing mich im Bett, seinem Krankenlager, an welches er seit Monaten gefesselt war. Er litt an Asthma, Angina pectoris und war am Star fast ganz erblindet. Herzlichst dankte er mir für meine Glückwünsche, die ich ihm zu seinem sechzigsten Geburtstage im Januar gesandt hatte, und nahm lebhaftesten Anteil an meinen letzten Reisen. Stundenlang unterhielten wir uns angeregt über philosophische und künstlerische Fragen und diskutierten die politische Weltlage. Als aufrichtiger Freund des ihm durch Reisen gut bekannten Deutschlands, als Verehrer und vorzüglicher Kenner Goethes stimmte er mit mir schon seit Jahren darin überein, daß engere geistige Beziehungen zwischen Indern und Deutschen jetzt eine tiefer begründete Zeitforderung wären. Obwohl ich meinen Freunden in Lahore sagte, daß ich den Eindruck eines kurz vor dem Tode Stehenden von ihm gehabt hätte, ahnte ich doch nicht, daß ich sein letzter Besucher sein sollte. Am nächsten Morgen brachten Extrablätter und alle Zeitungen Indiens die Nachricht von seinem am Donnerstag, dem 21. April, früh fünfeinhalb Uhr, einige Stunden nach meinem Besuch, erfolgten Ableben. Schulen, Universitäten, Gerichte und Basare wurden in ganz Indien zum Zeichen der Trauer geschlossen, und alle Mohammedaner trugen einige Tage Trauer. In den Zeitungen stand: »Am Mittwoch abend war Sir Mohammed Iqbal noch sehr munter und sprach lange mit dem Baron von Veltheim, einem deutschen Freunde. Sie diskutierten Philosophie und Politik bis etwa Mitternacht. Nachdem sein deutscher Besucher ihn verlassen hatte, schlief er bis zwei Uhr. Von Schmerzen aufgeweckt, fühlte er seinen Tod kommen. Er diktierte auf persisch seine letzten Verse. Seine letzten Worte waren: ‚Ich bin ein Muselman; ich fürchte den Tod nicht, ich werde ihn lächelnd begrüßen!' Dann verfiel er in Agonie und starb fünf Minuten später.« Die letzten Verse, welche der große Dichter eine Viertelstunde vor seinem Tode sprach, haben folgenden Inhalt, den ich aus der in den Zeitungen erschienenen Übertragung aus dem Persischen ins Englische weiterübersetze:

138

روز نامچے میں علامہ اقبال سے متعلق یاداشت

> Die Melodie ist gegangen! Mag sein, daß sie wiederkommt oder nicht wiederkommt!
> Ein Windhauch aus dem Hedjas mag kommen oder nicht kommen!
>
> Das ist das Ende der Tage dieses Bettlers!
> Ein anderer Weiser mag eines Tages wiederkommen oder nicht zurückkehren!

Es steht mir nicht zu, hier eine Würdigung der Gestalt und des Lebenswerkes des dahingeschiedenen Sir Mohammed Iqbal zu geben. Zweifellos ist er ein ganz großes Gestirn am asiatischen und besonders am mohammedanisch-indisch-persischen Geisteshimmel, ein Philosoph und Dichter von überzeitlicher Bedeutung. Sein Tod wurde in Indien als ein schwerer nationaler Verlust empfunden und von allen Mohammedanern auf der Welt tief betrauert. Ich darf es als eine ganz besondere Schicksalsfügung empfinden, sein letzter Besucher gewesen zu sein, zumal wir zufällig von verschiedenen Auffassungen über das Wesen des Todes bei Völkern und Einzelmenschen sprachen. Seinem Sohn, dem Sheikh Jawed Iqbal, schrieb ich einen Beileidsbrief, den ich dann in den Zeitungen veröffentlicht fand. Sein Vater wurde in einem besonderen Grabe, nicht auf dem Friedhof, sondern als Einziger an der großen goldenen Moschee in Lahore, unter größten Feierlichkeiten mit einem Trauergefolge von mehr als zehntausend Personen beigesetzt.

Am 20. April kam ich in Jammu-Tawi am Fuße der Himalayas an, wo mich Prof. Dr. Oberst Sir R. N. Chopra an der Bahn abholte. Lange vor der Ankunft sah ich vom Zuge aus die hohen Schneeketten der Himalayas. Meine Freude und Ergriffenheit, sie wiederzusehen, war sehr groß. Jammu ist die Winter-Residenz des Maharaja von Jammu und Kashmir am Fluß Tawi. Oberst Sir R. N. Chopra brachte mich in das Haus seiner Eltern, wo die etwa dreißig- bis vierzigköpfige Familie versammelt war. Ich wurde von seinem zweiundneunzig Jahre alten Vater und seiner sechsundsiebzigjährigen Mutter inmitten ihrer Kinder, Enkel und Urenkel empfangen. Der ehrwürdige Greis saß auf indische Weise auf einer Bank mit untergeschlagenen Beinen, neben ihm stand seine Frau, alle anderen standen oder hockten meist auf dem Boden. Der Zweiundneunzigjährige machte den Eindruck eines rüstigen Siebzigers, die Sechsundsiebzigjährige würde man für etwa sechzig halten. Beide waren kerngesund und geistig auf der Höhe. Die klugen, lebhaften, großen und schönen Augen des Zweiundneunzigjährigen sahen mich an, während er fließend Englisch mit mir sprach. Später ging

139

Horn des Fisches. Der Fisch zog den Nachen auf einen hohen Berg, wo Manu das Schiff festband und wartete, bis die Wasser sich verlaufen hatten. Da alle Geschöpfe ertrunken waren, lebte er dort zunächst ganz allein, schuf dann aber durch die Macht seiner Askese alle Wesen.«[1]

In diesem Bande war zuerst bei den Parsen von der Bedeutung des Fisches die Rede. Wir werden ihn in Kashmir, Afghanistan und Nepal in diesem Sinne noch öfters antreffen.

So standen wir an einem Punkte der Gebirgskette in Schnee und Eis und sahen unter uns ein Paradies im Frühlingsgewand. Die Obstbäume standen in Blüte! Ich glaubte zuerst, daß es auch Schnee wäre. Als wir im Tal angekommen waren, blühte und duftete lila und weißer Flieder. Staunend sah ich, wie die Wiesen voll wildwachsender, großer lila und weißer Iris, Krokus und anderer Blumen standen. Der Karfreitagszauber aus dem Parsifal mit Wagners Musik und den Worten des Gurnemanz zog durch mein Gemüt. Selbst auf den mit Lehm bedeckten flachen Dächern der Dörfer blühten die Iris. Die Straße, von hohen, schlanken Pappeln in jungem Grün eingefaßt, war voller Herden der reizenden kleinen Schafe, welche der Welt die beste, weichste und schönste Wolle schenken. Überall blühten große, wilde Lilien. Nach den zwei Tagen in dem majestätischen, meist vegetationslosen Ernst und Schnee der Himalayas und in den vorher erlebten üppigen, immer grünen Tropen wirkte dieser zauberische Frühling wie der Traum einer Paradieses-Wiedergeburt. Die kühle, ja fast kalte, aber ganz klare, reine Luft war voller Düfte. Alle ausgestandene Hitze der letzten Tage, Wochen, ja Monate war vergessen. Um richtig aufzutauen, tranken wir im ersten Dorf sahnige heiße Milch.

In den Dörfern stehen uralte Walnußbäume und riesige Bäume, welche persischen Ursprungs sein sollen und ‚Chenars' heißen. Ich halte sie für eine Platanen-Art. Sie sind ungewöhnlich dick, die Stämme haben einen Umfang von fünfzig bis zu sechzig englischen Fuß. Diese schönen Bäume sollen oft tausend und mehr Jahre alt sein. Gegen Abend setzte wieder ein herrliches Glühen der Schneeberge ein.

Auf der Weiterfahrt kamen wir an zwei alten Hindutempel-Ruinen vorbei. Die Bevölkerung von Kashmir ist zum weit überwiegenden Teile heute mohammedanisch. Der Herrscher, der Maharaja, ist

[1] Nach H. von Glasenapp, ‚Der Hinduismus'. München 1922. S. 91/92.

144

dagegen Hindu. Im Halbdunkel langten wir in unserem Quartier, zwei Meilen vor der Hauptstadt Srinagar, an. Bald nach unserer Ankunft, um halb zehn abends, war ein kleines Erdbeben.

Ich schlug an diesem ersten Abend im Frühlingstal von Kashmir folgende Stelle der Gita ‚zufällig' auf:

> Stets, wenn die Dämmerung dieses Tags beginnt, geht das gesamte offenbare All aus dem nichtoffenbaren Sein hervor und schwindet wieder, wenn die Nacht sich naht!

In Srinagar erschienen keine Zeitungen. So erfuhren das Kashmir-Tal und wir erst durch die heute früh, am 23. April 1938, hier eintreffenden Zeitungen aus Indien den Tod des Sir Mohammed Iqbal. Die Basare wurden sofort geschlossen. Ich dachte an seine handschriftliche Eintragung in mein Autographenbuch, als ich ihn vor zweieinhalb Jahren in Lahore besuchte. Diesen seinen Vers hatte ich ihm am Mittwoch noch zitiert. Er lautet – aus dem Englischen übersetzt – so:

> Lebe ein so beispielhaftes Leben, daß, wenn Dein Tod ewig ist, Gott beschämt wird, ihn ewig erschaffen zu haben!

Wie ähnlich ist der Sinn dieses Verses demjenigen seines letzten, unmittelbar vor seinem Tode diktierten Gedichtes! Sir Mohammed Iqbal war unter anderem auch Dr. phil. der Universität München, auf Grund einer Doktor-Arbeit über persische Philosophie. Er war ferner lange Zeit Professor des Persischen an den Universitäten Cambridge und London. 1922 wurde er vom König von England in den Adelsstand erhoben. In den Nachrufen der indischen Zeitungen steht, wenn auch Deutschland nicht seine geistige Heimat wäre, sei es unmöglich, den großen Einfluß, den Deutschland auf ihn hatte, außer acht zu lassen. In diesen meinen Reise-Erinnerungen möchte ich dem großen Philosophen und Dichter angesichts seiner letzten Verse folgende Verheißung aus der Bhagavadgita nachrufen:

> Wer vom Leben scheidet und dabei an Mich allein nur denkt, der geht, nachdem er von des Fleisches Banden freigeworden, in Meines Wesens höchstes Dasein ein. Denn er ist gleich dem Wesen, das er liebt!

Wir wohnten an einer scharfen Kurve zwischen den Dämmen des Jhelam-Flusses vor der Stadt. Das ganze Gelände gehörte meinem Gastgeber, Oberst Sir R. N. Chopra, der hier für jedes seiner Kinder je ein großes von Gärten umgebenes Haus gebaut hatte. Das uns-

روز نامچے میں علامہ اقبال سے متعلق یاداشت 145

اقبال سے آخری ملاقات از ہنس ہاسو

شام کے وقت میں معروف شاعر و فلسفی سر محمد اقبال سے ملا ۔انھوں نے بستر پر لیٹے لیٹے میرا استقبال کیا۔آپ کئی ماہ سے علیل تھے اور اسی علالت کے ان کا اٹھنا بیٹھنا محال تھا ۔انھیں دل کا عارضہ تھا جو اب شدید صورت اختیار کر چکا تھا ،ایستھما کی تکلیف الگ سے زوروں پر تھی ،آنکھ میں موتیا اتر آنے کے سبب ان کی بینائی تقریباً زائل ہوچکی تھی ۔اتنی علالت کے باوجود ان کی یاداشت اچھی تھی ،انھوں نے فراخدلی سے میری ان نیک خواہشات کا شکریہ ادا کیا جو میں نے انھیں جنوری میں ان کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر کارڈ کی صورت میں ارسال کی تھیں۔ انھوں نے میری حالیہ سیاحتوں کو سراہا اور ان میں اپنی دل چسپی کا اظہار بھی کیا۔ہم گھنٹوں فلسفہ اور فن کی نزاکتوں پر بات چیت کرتے رہے، عالمی سیاسی صورتِ حال پر بھی ہم نے کھل کر باتیں کیں ۔اقبال جرمنی میں کچھ عرصہ رہ چکنے کے سبب اور خاص طور پر گوئٹے کے مداح ہونے کی وجہ سے جرمن تہذیب سے خوب واقف تھے ۔گذشتہ کئی سالوں سے وہ میری اس رائے کی پر جوش تائید کرتے چلے آرہے تھے کہ جرمنی اور ہندوستان کے مابین ٹھوس اور بنیادی روابط مستحکم کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

اگرچہ میں لاہور میں اپنے دوستوں کے سامنے اپنے اس تاثر کا اظہار کر چکا تھا کہ میں ایک شخص

سے ملنے جا رہا ہوں جو موت کے نزدیک کھڑا ہے لیکن مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ میں ان کا آخری ملاقاتی ثابت ہوں گا۔اگلے روز جمعرات ۲۱ اپریل کی صبح کو میری ملاقات کے چند گھنٹے بعد ہندوستان بھر کے ضمیمے اس خبر کے ساتھ شائع ہوئے کہ اقبال وفات پا گئے ہیں ۔ میری اس ملاقات کے پانچ گھنٹے بعد ان کا انتقال ہوا۔پورے ہندوستان کے سکول، جامعات،عدالتیں اور بازار اس سوگ میں بند کر دیئے گئے ۔ان کی وفات پر اخباروں میں لکھا گیا:

''بدھ کی رات آپ بہت ہشاش بشاش تھے ۔ جرمنی سے آپ کے ایک پرانے دوست بیرن فان والتھائیم ملنے کے لیے آئے تو آپ نے بہت دیر تک ان سے باتیں کیں۔ان کے درمیان فلسفہ اور سیاست پر گفتگو آدھی رات تک جاری رہی ۔ جب مہمان اٹھ کر روانہ ہوا تو آپ سونے کے تشریف لے گئے ۔۲ بجے (رات) آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے بائیں ٹانگ پر سوجن کی شکایت کی ۔۔۔سر محمد اقبال نے آخری کلمات ادا کرتے ہوئے کہا ''میں مسلمان ہوں ۔میں موت سے نہیں گھبراتا۔میں اس کا استقبال مسکراتے ہوئے کروں گا۔''

ان جملوں کے بعد آپ اذیت کی کیفیت میں چلے گئے اور پانچ منٹ بعد اپنی جاں خالقِ حقیقی کے سپرد کر دی ۔اس عظیم شاعر نے اپنی موت سے پندرہ منٹ پہلے جو اشعار کہے،ان کا متن میں نے اخبارات سے حاصل کیا۔یہ اشعار فارسی میں ہیں، میں ان کا جرمن میں ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(وہ سرور جو اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے اب لوٹ کر آئے گا یا نہیں آئے گا ؟ حجاز سے ہوا کا کوئی جھونکا آئے گا یا نہیں آئے گا۔اس فقیر کا عرصہ ء حیات اب تمام ہوتا ہے،کوئی دوسرا دانائے راز اب آئے گا یا نہیں آئے گا۔)

میرا یہ منصب نہیں اور نہ ہی میں خود کو اس بات کا اہل سمجھتا ہوں کہ میں اقبال کی شخصیت اور ان کے فن کا محاکمہ پیش کروں ۔ تاہم ، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اقبال ایشیاء کی عظیم شخصیات میں نہایت نمایا ں مقام کے حامل تھے ۔خاص طور پر ہندوستان اور ایران کے تہذیبی اور علمی افق پر ان کی حیثیت روشن ستارے کی تھی ۔آپ فلسفیوں اور شاعروں میں چیزِ دگر تھے۔ان کی وفات کو پورے ہندوستان میں قومی سا نحے کے طور پر محسوس کیا گیا۔پوری دنیا کے مسلمانوں نے اپنے اس ملی نقصان کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ آپ

دیدہ بھی ہوئے۔

یہ تقدیر کا عجیب اور اتفاقی امر ہے کہ میں ان کا آخری ملاقاتی تھا۔اس ملاقات میں ہم خاصی دیر تک قومی اور شخصی موت کے مابین تفاوت اور ان کے نظریات اور رجحانات پر باتیں کرتے رہے ۔اس موضوع کے حوالے سے انھوں نے بڑی خرد افروز گفتگو کی ۔ان کے فرزند جاوید اقبال کو میں نے تعزیت نامہ ارسال کیا جو ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوا۔ان کے والدِمحترم کو قبرستان میں دفن کرنے کی بجائے بادشاہی مسجد کے سامنے مخصوص جگہ پر ہزاروں عقیدت مندوں کی موجودگی میں سپردِخاک کیا گیا۔

وادیء کشمیر اور سری نگر سے کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا۔آج ۲۳ اپریل ۱۹۳۸ کو ہندوستان سے آنے والے اخبارات کے ذریعے سر محمد اقبال کی وفات کی اطلاع پہنچی تو سارے بازار بند ہوگئے ۔اس لمحے مجھے اقبال کا آٹوگراف بڑی شدت سے یاد آیا جو انھوں نے اڑھائی سال پہلے میری ڈائری پر دیا تھا۔اس آخری ملاقات میں ،میں نے ان کے سامنے ان کے آٹوگراف کے الفاظ دہرائے بھی تھے۔اس شعر کا جرمن ترجمہ پیش کرتا ہوں ۔

چناں بزی کہ مرگِ ماست مرگ دوام
خدا کردہ خود شرمسار تر گردد

یہ بھی کیسا اتفاقی امر ہے کہ آٹوگراف ڈائری پر لکھے جانے والا یہ شعر اقبال کے آخری کلمات سے مماثل ہے۔سر محمد اقبال نے دیگر علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ فلسفہء عجم پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری میونخ یونیورسٹی سے حاصل کی ،کیمبرج اور لندن یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے رہے ۔۱۹۲۲ میں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے انھیں ''سر'' کا خطاب ملا۔

جرمنی اقبال کا آبائی وطن نہ تھا اور نہ ہی اس سرزمین میں ان کی جڑیں بہت گہرائی میں تھیں۔تاہم، یہ حقیقت ہے کہ اقبال کی فکری بالیدگی میں جرمنی نے بہت اہم کردار ادا کیا۔جرمن زبان وادب کے اقبال پر اثرات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ۔اقبال کے آخری کلمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اور اپنی سیاحتی یادداشتوں کو مجتمع کرتے ہوئے میں''بھگوت گیتا'' کے یہ چند الفاظ اقبال کے حضور پیش کرتا ہوں :

''وہ جو زندگی سے جدا ہوتے ہوئے دودھیا نور کا تصور اپنے دل میں لئے اوپر اٹھ رہا ہے
جسم کی بندشوں اور اس کی حدوں سے باہر نکل رہا ہے،میرے نزدیک وہ نہایت ارفع مسند کی
طرف بڑھ رہا ہے کیونکہ وہ اس ہستی سے ہم آغوش ہونے چلا ہے کہ جس کی چاہت میں اس
نے اپنی زندگی گزاری تھی۔''

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ *The Civil and Miltary Gazzete,Friday,22 April,1938,Vol.Lix, No.4299 ,P.1*

۲۔ Hans Hasso von Veltheim,*Tagebucher aus Asien,*Vol.1 (Hamburg: Claassen Verlag, 1956) *P.139*

۳۔ عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال (لاہور: بزمِ اقبال، س۔ن، عرض حال یکم جون ۱۹۵۵ء) ص ۲۲۱، ۲۲۲

۴۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء) ص ۱۸۷

۵۔ آنا ماری شمل، ''اقبال اور جرمنی'' مشمولہ اقبال: مشرق و مغرب کی نظر میں (لاہور: سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، گورنمنٹ کالج لاہور) ۲۰۰۲، ص ۷۰

مآخذ:

۱۔ اقبال، جاوید۔ زندہ رود۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴۔

۲۔ سالک، عبدالمجید۔ ذکرِ اقبال۔ لاہور: بزمِ اقبال، س۔ن۔

۳۔ Hans Hasso von Veltheim, *Tagebucher aus Asien,*Vol.1 Hamburg: Claassen Verlag, 1956.

☆☆☆